باب پنجم

ماحصل

باب اول کا ماحصل:۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار کمالات، مختلف صلاحیتوں اور قوتوں سے نوزا ہے۔ اس بنا پر وہ اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں کی خواہشِ نمود بھی رکھتا ہے اور اپنے آپ کو نمایاں بھی کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز اسکی جبلت میں رکھ دی گئی ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کو نظرانداز نہ کر کے اسکی ذات وصفات کا اعتراف کیا جائے۔ اس خودنمائی کے نفسیاتی عوامل مختلف ہوتے ہیں جیسے دوسروں کو متاثر کرنا، مرعوب کرنا یا مستفید کرنا۔ اسی طرح دوسروں کے سربستہ رازوں کو جاننے کی خواہش بھی انسانی فطرت اور جبلت کا اہم خاصہ ہے۔ خودنوشت لکھنا اور پڑھنا بھی اسی طرح لازم وملزوم ہے یعنی جہاں ایک طرف خودنوشت نگار قارئین کو اپنی ذات سے آگاہ کرانا چاہتا ہے تو وہیں دوسری طرف قارئین بھی کسی کامیاب، متاثر کن اور اپنے سے بالاتر شخصیت کی زندگی کے بارے میں جاننا پسند کرتے ہیں۔

خودنوشت اُردو کے نثری اصناف میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ مصنف کی مکمل داستان زندگی ہوتی ہے۔ یہ زیست کی ایسی دستاویز ہوتی ہے جس میں خودنوشت نگار اپنی ولادت، تعلیم وتربیت، خاندانی پس منظر، ماحول، اپنے حالات، کمالات، تجربات، عادات، خیالات، احساسات، جذبات، مشاہدات، خدمات، معاشرت، ازدواجی زندگی، اولاد، احباب، اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، مذہبی، تعلیمی، ادبی، ملی، قومی، ملکی، بین الاقوامی حالات وواقعات کو ادبی پیرایۂ اور اُسلوب میں قلمبند کر کے پیش کرتا ہے۔ یوں یہ خودنوشت مصنف کی داخلی اور خارجی زندگی کی آئینہ بن جاتی ہے۔ اس میں مصنف ان باتوں کا ذکر زیادہ اہتمام سے کرتا ہے جنہوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر اسے بہت متاثر کیا ہوتا ہے۔ یعنی جو باتیں خود نوشت نگار کے دل ودماغ میں ہوتی ہیں وہی چیزیں کاغذ کے صفحے پر منعکس ہو جاتی ہیں۔ خودنوشت سوانح حیات میں مصنف کی ذات ہی مصدر، منبع، ملجا، ماخذ اور مرجع ہوا کرتی ہے۔ اس نامۂ اعمال کے لیے وہ خود مجرم، خود گواہ اور خود جج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں چونکہ مطمحِ نظر، ہیرو یا کردار کی شخصیت ہوتی ہے اس لیے روشنی کا حلقہ ابتدا سے آخر تک مصنف کی ذات کو احاطے میں لیکر جگمگاتا رہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ دیگر اشخاص یا دوسروں کے واقعات کا خودنوشت میں در آنا بھی قدرتی عمل ہے لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ اس سے مصنف کے بشمول اسکے عہد اور ماقبل کے عہد کے سیاسی، سماجی، ادبی،

مذہبی، معاشی، معاشرتی، ملکی اور بین الاقوامی منظر نامے سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے جو کسی صورت خالی از نفع نہیں سمجھی جا سکتی۔ لہٰذا جن باتوں کا بھی مصنف ذکر کرتا جاتا ہے وہ اپنے آپ میں ہر اعتبار سے اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ان سے طرح طرح کے پردے اُٹھتے ہیں جو حقیقت کے متلاشی شخص کے لیے کار آمد ہو سکتے ہیں۔ اس سے انفرادی اور اجتماعی لاشعور تک بھی رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ غرض خودنوشت میں ہر بیان کی جانے والی بات کی اپنی جگہ اہمیت ہوتی ہے اور کہیں نہ کہیں یہی باتیں مصنف کی شخصیت کی تشکیل کے پیچھے کارفرما ہوتی ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے خودنوشت نہ صرف مصنف کی نفسیاتی گرہوں اور اُلجھنوں کو سمجھنے میں معاون بنتی ہے بلکہ یہ کسی عہد کی نفسیاتی کشمکش کی گرہیں کھولنے میں بھی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ یوں اس سے ادیب، ادب اور عہد کی نفسیات کی فہمائش آسان ہو جاتی ہے۔

آپ بیتی لکھتے وقت مصنف خود کا مشاہدہ بھی اس آئینہ میں کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہر سعی کرتا ہے۔ قارئین بھی مصنف کی ذات میں خود کو دیکھتے ہیں یا اسکی شخصیت کے ساتھ خود کا موازنہ کرتے ہیں۔ انہیں ایک طرح کا حوصلہ اس سے ملتا ہے یا ایسی معتدل راہ ملتی ہے جس سے وہ بہتر انداز سے زیست کرنے کا ہنر سیکھ سکتے ہیں اور ان کے رنج والم اور حزن وکرب کا بوجھ کسی حد تک ہلکا ہو سکتا ہے۔ ان کی زندگی کی کٹھنایاں گھٹ سکتی ہیں۔ اس لیے آپ بیتی کو محض واقعات کی خشک کھتونی سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ایک دستور العمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اسکی ایسی خوبی ہے جو ہر دور میں اس کی اہمیت میں اضافہ کرتا رہے گا۔

خودنوشت نگار کے لیے ہیئت کی قید نہیں البتہ خودنوشت سے متعلق چند شرائط کا پایا جانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جن میں ''صداقت وحق گوئی''، ''مصنف کی شخصیت'' اور ''فن'' ایسے معیارات ہیں جن سے کسی خودنوشت کا ادبی مقام متعین کیا جاتا ہے۔

اُردو خودنوشت سوانح نگاری کی اقسام کے متعلق اہلِ ادب کی آرا مختلف ہیں اور اسکی کوئی حتمی تعداد متعین نہیں ہے۔ سوانحی تکمیل کی رو سے خودنوشت سوانح حیات دو حصّوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ مکمل خودنوشت اور نامکمل خودنوشت۔ بلحاظ ہیئت اگر بات کی جائے تو جذباتی، تذکراتی، منظوم خودنوشتیں اس کی اقسام قرار دی جاتی ہیں۔

موضوع اور مواد کے حوالے سے خودنوشت کو کئی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیسے مذہبی خود نوشت، تاریخی خودنوشت، افسانوی خودنوشت اور ادبی خودنوشت۔

خودنوشت کے محرک کی بات کی جائے تو، ہر ایک تخلیق کے پس پشت عوامل یا وجہِ تخلیق ضرور ہوتی ہے۔ اسی طرح خودنوشت تخلیق کرنے کے پیچھے بھی کچھ اسباب، کچھ عوامل ایسے ضرور رہتے ہیں جنکی وجہ سے یہ وجود میں آتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب خودنوشتوں کا محرک مشترک ہو لیکن یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ خودنوشت کا کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے۔ خود پسندی وخود پرستی، شدید نفسیاتی دباؤ، اعتراف واحساس جرم، اپنے تجربات اور کارناموں سے لوگوں کو روشناس کرانا اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا یا صفائی پیش کرنا ایسے محرکات ہیں جو بالعموم خودنوشتوں کے پس پردہ کارفرما ہوتے ہیں۔

عہدِ پارینہ کے ہندوستان میں خودنوشت نگاری کا چلن نہیں تھا۔ اس عہد میں اگر اس قسم کی کوئی شئے ملتی بھی ہے تو وہ ادب کے زمرے میں شامل نہیں کی جا سکتی۔ اسکی باضابطہ روایت برصغیر میں مسلم دور حکومت سے ملتی ہے۔ لیکن اس کے لیے زبان فارسی استعمال ہوتی تھی۔ اُردو میں خودنوشت سوانح کی عمر زیادہ لمبی نہیں ہے۔ اس کی تاریخ کا سفر قریب ڈیڑھ سو سال پر پھیلا ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر سے اسکی باقاعدہ شروعات ہوئی۔ تاہم اس نے بہت جلد ترقی کے منازل طے کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے وہ رفتار پکڑی کہ اس کا خاطر خواہ سرمایہ وجود میں آ گیا۔ آج اُردو خودنوشتوں کی تعداد ہزاروں میں پہنچ چکی ہے۔ خودنوشت کی صنف اُردو میں اب بھی ترقی کے زینے تیزی سے چڑھ رہی ہے اور آج بھی مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ حضرات اس صنف کو اپنے تجربات، مشاہدات، محسوسات، عقائد ونظریات اور افکار وخیالات پیش کرنے کے لیے ایک اہم وسیلہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔

باب دوم کا ماحصل:۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اشرفیت دیگر مخلوقات پر بخشی ہے اس کی وجہ اس کا شعور ہے۔ انسان نے اس شعور کی بدولت دنیا کے بے شمار علوم سیکھے اور ان تجربات و مشاہدات میں اس نے اپنی اہلیت و مہارت کا ثبوت اس درجہ میں دیا ہے کہ اسے بیان میں نہیں لایا جاسکتا۔ علم و ترقی کے منازل طے کرتے کرتے اسے اپنی ذات کا بھی خیال آیا کہ وہ کیا ہے؟ اس سربستہ راز کی عقدہ کشائی کے لیے اس نے اپنے آپ میں ڈوب کر سراغِ جبلت کی تلاش کا عزم کیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ میں ایسا کیوں ہوں؟ یہی وہ بنیادی سوال تھا جس پر علم نفسیات کی بنیاد پڑی۔

عصر حاضر میں جدید ماہرین نے نفسیات کو Study of Human Behaviour یعنی انسانی کردار کا مطالعہ کہا ہے۔ سائنس کی بنیاد جس طرح تجربے اور مشاہدے پر ہے اسی طرح نفسیات نے بھی زندگی کے کچھ مسائل کی عقدہ کشائی، مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ نفسیات میں فرد کی شخصیت، اسکے طرزِ عمل، جذبات و احساسات، طرزِ ادا، فکر و رجحان، داخلی کیفیات کے منجملہ مسائل کا تجزیہ سائنسی نقطہ نگاہ سے کیا جاتا ہے۔

علم نفسیات کے تحت کردار کا مطالعہ ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں صرف اعصابی کیفیات ہی نہیں بلکہ جسمانی حرکات و سکنات کو بھی نفسیاتی زاویے سے ٹٹولا جاتا ہے۔ اس علم کی روشنی میں اسکے ان اعمال و افعال کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے جو ماحول سے متاثر ہونے کی صورت میں ظہور میں آتے ہیں۔ اس میں خواب اور ادب کی مدد سے بھی انسان کی ذہنی حالت اور وہاں پوشیدہ رازوں کو کھولنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لہذا یہ کہنا مناسب ہے کہ ادب، ادیب کے دماغ کا وہ دروازہ ہے جس سے گزر کر اسکے لاشعور تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے اور دونوں کو بہتر انداز میں تبھی سمجھا سکتا ہے جب نفسیات کی حیثیت سے انہیں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

ایک انسان وقتاً فوقتاً مختلف تصادموں سے گھرا رہتا ہے۔ کبھی اسکا تصادم خود کی ذات کے ساتھ اس کے اندر چل رہا ہوتا ہے، کبھی یہ ٹکراؤ سماج کے ساتھ ہوتا ہے، کبھی باہر کسی شخص کے ساتھ وہ برسر پیکار ہوتا ہے، کبھی قدرت کے ساتھ وہ اپنے حوصلوں کا امتحان دیتا ہے، کبھی مافوق الفطرت عناصر کے ساتھ

اسے لڑنا پڑتا ہے اور آج کے دور میں تو ٹیکنالوجی کے ساتھ وہ متصادم ہے۔ ایسی حالت میں اس کے اندر مختلف نفسیاتی کشمکشیں جنم لیتی ہیں جس سے اسکی زندگی پر منفی اور مثبت دونوں طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان نفسیاتی کشمکشوں کے اثرات ایک ادیب اور شاعر کے فن پر بھی پڑتے ہیں بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ سب سے زیادہ اسکی واضح مثالیں ان ہی کے یہاں ملتی ہیں کیونکہ وہ سماج کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں۔ یہ اثرات تعمیری و تخریبی شخصیت اور ادب کی تشکیل کرتے ہیں۔

انسانی نفسیاتی کشمکش کی وضاحت اور اسکے اثرات کو شرح و بسط سے پیش کرنے کے لیے مقالے میں جن مختلف ماہرینِ نفسیات کے نظریات اور آرا سے استفادہ کیا گیا ہے وہ فرائڈ، یونگ، ایڈلر اور اریکسن ہیں۔ یہاں مختصراً بالخصوص ان ماہرین کے نظریات کو پیش کیا جائے گا جن کی آرا کی روشنی میں مقالے میں شامل خودنوشتوں میں موجود مختلف نفسیاتی کشمکشوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور پھر ان کی مدد سے مصنفین کی شخصیت کی گرہیں کھولنے کی سعی کی گئی ہے۔

سگمنڈ فرائڈ: نفسیات میں سب سے انقلاب آفرین شخصیت فرائڈ کی ذات ہے۔ اس نے اپنے فلسفہ سے نفسیات اور ادب کو ایک نئی جہت دی۔ ان کی جس کتاب نے پوری دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی دُنیا میں ہلچل مچائی وہ ان کی مشہورِ زمانہ کتاب ''تعبیرِ خواب کا نظریہ'' ہے۔ تحلیل نفس نظریہ کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ یہ طریقہ کسی فرد کی باہری دنیا سے گزر کر اندر کی دنیا تک رسائی حاصل کراتی ہے۔ اس میں معاشرے یا ماحول کے برخلاف فرد کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ذریعہ انسان کی اُدھوری خواہشات اور اسکی وجہ سے پیدا شدہ اعصابی الجھنوں کو سلجھانے میں مدد دیتا ہے۔ اس کے توسط سے نہ صرف داخلی تحریکات کی کھوج کی جاتی ہے بلکہ یہ موقع بھی ملتا ہے کہ لاشعوری خواہشات کو شعور کی سطح پر لا کر قابو کیا جا سکے۔ لہٰذا یہ کہنا دُرست ہوگا کہ تحلیلِ نفسی کسی فرد کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو روشن کرتا ہے جو اکثر پردۂ اخفا میں رہے ہوتے ہیں۔ فرائڈ نے تحلیلِ نفسی کے نظریے کی بنیاد پر ذہن کے تین حصّے بتائے ہیں: شعوری ذہن، لاشعوری ذہن اور تحت الشعوری ذہن۔

فرائڈ شخصیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا تحرک دو جبلتوں ایروس (eros) اور تھیناٹوس (thanatos) کے تابع ہے۔ پہلی جبلتِ حیات (life instincts) اور دوسری جبلتِ

ممات (Death instincts) ہے۔ یہ دونوں جبلتیں لبیڈو کے دو رُخ ہیں، یعنی ہر وہ کام جو انسانی زیست کی ترقی کا ضامن ہو، وہ جبلتِ حیات ہے۔ یہ تلاشِ زیست کا نام ہے، جو مہد سے لیکر لحد تک باقی رہتی ہے۔ اس کا ظہور تمام زندگی بخش رجحانات یعنی خواہشِ نمو، تخلیقی اظہار، ارتقائی عمل، بقائے نسل، تہذیب اور سب سے اہم محبت وغیرہ میں ہوتا ہے۔ فرائڈ تقاضۂ زیست کے مقابلے میں تقاضۂ مرگ کا تصور بھی پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ تمام تعمیری عمل تقاضۂ زیست کا نتیجہ ہے جبکہ تمام تخریبی عمل تقاضۂ مرگ کا۔ تقاضۂ مرگ کی تسکین اذیت دہی (sadism) یا اذیت کوشی (masochism) کے جذبات سے ہوتی ہے۔ یہ لبیڈو کی منفی صورت ہے۔ اس کو Morbido بھی کہتے ہیں۔ اس میں انسان ہمیشہ منفی خواہشوں کی جانب کشش محسوس کرتا ہے۔ جیسے جارحیت، ظلم و جبر، استحصال وغیرہ کی طرف۔

فرائڈ کا نظریہ جنسی قوت یا لبیڈو کے گرد گھومتا ہے یعنی وہ جنس کی عینک سے سارے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے۔ وہ نہ صرف مرد اور عورت کا ایک دوسرے کے تئیں دلچسپی رکھنا لبیڈو سمجھتا ہے بلکہ اس سے پیدا شدہ کشمکش اور شخصیت کے انتشار کو بھی اسی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ اسکے مطابق ایڈ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی جبلی خواہش کی تسکین چاہتا ہے، خواہ وہ کسی کی نظر میں کتنا ہی معیوب کیوں نہ ہو۔ ہاں اگر اس جذبے کی تسکین سماجی اور قانونی ضابطوں کے تحت پوری ہو تو شخصیت انتشار اور اُلجھن سے محفوظ رہتی ہے لیکن اگر اس جذبے کو مناسب اور بروقت ماحول میسر نہ ہو تو یہ کئی نفسیاتی پیچیدگیوں کو جنم دیتی ہے اس لیے وہ ایڈ کو نفسی قوت کا مرکز کہتا ہے، جس کا سارا نظام اصولِ لذت (pleasure principle) کی بنا پر کام کرتا ہے۔

فرائڈ نے شخصیت کے تشکیلی عناصر کو جن تین مرکزی حصّوں میں تقسیم کیا ہے وہ ایڈ، انا اور فوق انا ہیں۔ یہ تینوں عناصر انسانی ذہن میں توازن اور عدم توازن کے لیے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ فرائڈ کے یہاں شخصیت ''ایک متحرک شئے'' ہے جو تینوں حصّوں پر محیط ہوتی ہے۔ ان تمام حصّوں میں بعض اوقات اتحاد و اشتراک اور توازن بھی رہتا ہے اور کبھی یہ باہم ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتے ہیں اور انتشار کے شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ بنیادی طور پر اپنے اصولوں میں جداگانہ خاصیتیں رکھتے ہیں۔

فرائڈ نے تحلیلِ نفس کی بنیاد پر جس قوت کو سب سے اہم مانا ہے وہ محبت پر قائم ہے، خواہ وہ کسی بھی

شئے سے متعلق ہو جیسے انسان،تصورات، یا غیر جاندار چیزوں سے۔اسکے نزدیک انسانی زندگی میں جنسی نشوونما کی کئی منزلیں طے ہوتی ہیں۔

فرائڈ کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے انسانی شخصیت کے عمیق پہلوؤں تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس کے یہاں جن تصورات پر سب سے زیادہ زور ملتا ہے، وہ نکات ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں:

ا۔انسان کے اندر بےشمار اعمال وافعال لاشعور کے حصّے میں نہاں رہتے ہیں جن کا ادراک اسے خود بھی نہیں ہوتا ہے۔ان کا ارتفاع ہونا ضروری ہے۔یہ خواب، علاماتِ خواب یا ادب کے استعمال سے ہوسکتا ہے۔

۲۔سِن بلوغت کے جو کئی مریضانہ افعال نیوراتی علامتیں اور کشمکشیں ہیں، وہ طفلی جنسیت کے غلبے یا مزاحمت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

۳۔جنس انسان کا بنیادی محرک ہے، اس میں اوڈیپس اُلجھن یا الیکٹرا کامپلکس کے مختلف محرکات کے مظاہرے عمل میں آتے ہیں۔

۴۔فرائڈ نے تحلیلِ نفس کا جو نظریہ سامنے لایا ہے، اُس میں آزاد تلازمۂ خیال کو بہتر تصور مانا گیا ہے۔

کارل گسٹو یونگ: فرائڈ کے مقلدین میں سب سے اہم نام یونگ کا ہے۔ وہ فرائڈ کے صرف جنسی توانائی کو لبیڈو ماننے کے برخلاف متفرق توانائیوں کو بھی لبیڈو میں شمار کرتا ہے۔یونگ کے نزدیک انسانی زندگی میں اس کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے اور جنسی توانائی بھی اس کا ایک حصّہ ہے۔انسانی شخصیت جس توانائی کو بروئے کار لاتے ہوئے نفسیاتی فرائض سرانجام دیتی ہے، وہ نفسی توانائی کہلاتی ہے۔یونگ کا نظریہ ہے کہ انسان کی جمیع نفسی توانائیوں کا اظہار لبیڈو ہے۔مثلاً انسان کی کوششیں، ارادے، خواہشیں، مرضی، حقیقی قوت وغیرہ۔ جوانی میں نفسی توانائی زیادہ تر جنس سے متعلق ہوتی ہے۔اسکے مطابق لبیڈو وہ حیات بخش توانائی ہے جس کے جملہ مظاہر فطرت میں نہاں ہیں اور جنسی جبلت محض اس کا ایک حصّہ ہے جو ایک تخلیقی توانائی ہے۔ وہ مزید یہ بھی کہتا ہے کہ جنس بھی دیگر محرکات کی طرح ایک حیاتیاتی قوت کا منبع ہے۔اسکا خیال ہے کہ لاشعور بعض مکرہ خواہشات کا گودام نہیں، بلکہ یہ جمیع تخیلی زندگی، وجدانی بصیرت، الہامات اور عاقبت بینیوں کا منبع ہے۔اس میں ہماری ذہنی حیات کی ساری

جبلی محرکات کے ساتھ ساتھ ضبط شدہ رجحانات بھی شامل ہوتے ہیں۔ یونگ انا (Ego) کو شعوری ذہن کہتا ہے، جس میں شعوری خیالات واحساسات، شعوری وجدان وادراک اور شعوری یادیں پائی جاتی ہیں، اسکا مزید ماننا ہے کہ شعور بیک وقت صرف کچھ خیالات کو ہی قبول کرتا ہے باقی لاشعور کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ وہ لاشعور کو دو حصّوں انفرادی لاشعور اور اجتماعی لاشعور میں تقسیم کرتا ہے۔

یونگ کے سر اجتماعی لاشعور کی دریافت کے ساتھ ساتھ ایک اور دریافت کا سہرا بھی جاتا ہے۔ اس نے انسانی شخصیت میں دو ایسے رجحانات کی دریافت کی ہے جو اپنے آپ میں نہایت قوی الاثر ہیں۔ وہ انسان کو عادات واطوار کی بنیاد پر دو حصّوں دروں بیں شخصیت اور بیروں بیں شخصیت میں بانٹتا ہے۔

یونگ انسانی شخصیت کو صرف دروں بیں اور بیروں بیں کی نظر تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اس نے کارکردگی کے لحاظ سے بھی انسانی شخصیت کو چار حصّوں میں منقسم کیا ہے۔ وہ چار حصّے ’فکری‘، ’وجدانی‘، ’جذباتی‘ اور ’حسی‘ ہیں۔ اسکے بقول انسانی طرزِ حیات کی تشکیل میں جو چار رجحانات پائے جاتے ہیں ان میں صرف ایک شعوری ہوتا ہے باقی سب لاشعوری ہوتے ہیں۔

یونگ نے فرائڈ کے نظریے کے برخلاف یہ بتانے کی بھی کوشش کی کہ فرد جبلی قوتوں کا غلام نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی معراج اور ارتقا کی طرف مائل رہتا ہے۔ فرائڈ کے مطابق شعور سے زیادہ لاشعور انسان پر اثر انداز ہوتا ہے اور قوی ہوتا ہے، وہ سُپر ایگو کو سماجی ضمیر کے ہم وزن قرار دیتا ہے۔ جبکہ یونگ انسانی شعور، تخلیقی ورجحانی عنصر اور علامت سازی کو زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ وہ چاروں رجحانات کی عمل آوری اور روحِ انسانی میں مخالف جنس کے اشتراک سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ انسان دیگر مخلوقات سے کن معاملات میں افضل واشرف ہے اور کس طرح اجتماعی لاشعور اس کو متاثر کرتا ہے۔ یونگ کے ان خیالات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اجتماعی لاشعور کے تصورات، نقوشِ موروثی، نفسیات کے امکانات اور علامت سازی کا سرچشمہ ہے۔

ایلفرڈ ایڈلر: ایلفرڈ ایڈلر فرائڈ کے ایک مشہور شاگرد اور ہم عصر ماہرِ نفسیات تھے، جنہوں نے یونگ کی طرح فرائڈ سے کئی ایک جگہ اختلاف کرکے علمِ نفسیات میں نئی جہتیں وا کیں۔ ایڈلر کا نظریہ فرائڈ کے اس نظریے سے بالکل مختلف ہے کہ انسان کی نفسیاتی کشمکش کی وجہ جنسی جبلت کا ہونا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

دراصل انسان احساسِ کمتری کا شکار ہے، یعنی کوئی شخص جب تمام عمر کسی مقصد یا خواہش سے محروم رہے، اس وجہ سے اس میں احساسِ کمتری کا جذبہ جنم لیتا ہے اور وہ خود کو کمتر اور ناتواں محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر فرد احساسِ کمتری کی منزل سے گزرتا ہے اور وہ اس اُلجھن سے نکلنے کے لیے ہمہ وقت نجات کے راستے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسکے مطابق ہر انسان تلافی کے طریقہ کار کی بدولت اپنے جسمانی اور ذہنی خامیوں اور کمتری کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مزید کہنا ہے کہ فن بھی احساسِ کمتری کی تلافی کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی مدد سے فنکار اپنی احساسِ کمتری کی تلافی سماجی نصب العین سمجھ کر تبدیل کر دیتا ہے۔

ایڈلر، فرائڈ کے نظریہ ''جنسی جبلت'' کے برخلاف ''رعایتِ ذات'' کو اہمیت دیتا ہے۔ اسکا ماننا ہے کہ نفسیاتی امراض کا سبب، جنسی جبلت نہیں بلکہ وہ احساس کمتری ہے جو شکست یا محرومی کے بعد جنم لیتی ہے۔ ایڈلر جنسی خواہش کے علی الرغم قوت کے حصول کی خواہش کو اہم سمجھتا ہے۔ اس کے مطابق جب تک معاشرے کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے اور اُصولوں کی پاسداری اور احترام نہیں ہوگا، احساسِ کمتری برتری کے رجحان میں تبدیل نہیں ہوگی نہ تسلی بخش آسودگی مل پائی گی۔

اریک اریکسن: فرائڈ سے متاثر ایک اور عبقری شخصیت اریک اریکسن کی ہے۔ اس نے نظریۂ شناخت کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی چند قیمتی آرا اس حوالے سے دی ہیں۔ اس نے فرائڈ کے نظریے سے بعض حد تک اتفاق کرتے ہوئے مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ انسان عمر میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ ہر مرحلہ میں اسے کچھ اہم کشمکشوں سے سابقہ پڑتا ہے جنہیں وہ کرائیسس (Crisis) کہتا ہے۔ اریکسن کا خیال ہے کرائیسس crisis اگر مثبت ہوں تو وہ شخصیت پر خوشگوار اثرات مرتب کرتے ہیں جبکہ اگر منفی ہوں تو شخصیت پر بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ مثبت کرائیسس (crisis) سے انسان Ego identity کر پاتا ہے یعنی وہ خود کو بہتر طور سے سمجھنے لگ جاتا ہے اور منفی صورت میں وہ انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ خود کی پہچان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

اریکسن نے جو تجربے بچوں اور انسانوں کی نفسیات پر کیئے، ان کے نتائج کی روشنی میں وہ اپنی تحقیق (Psychosocial Development Theory) کو آٹھ مختلف مراحل میں تقسیم کرتا ہے۔ اس

کے مطابق ہر فرد زندگی میں ایک مرحلے سے گزرتا ہوا دوسرے مرحلے کی طرف بڑھتا ہے لیکن ماضی کے مرحلے کے اثرات نئے مرحلے پر بھی وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا ماہرین نفسیات کے نظریات کی رو سے اگر ادب پر نفسیاتی کشمکش کے آثار کو تلاش کیا جائے تو ہر عہد کے ادب میں لازماً انسانی فطرت کی ان کشمکشوں کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔یعنی یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جب سے ادب وجود میں آیا ہے تب سے کوئی نہ کوئی کشمکش کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوگی۔لیکن ادب میں ان کشمکشوں کی گرہ کشائی باضابطہ طور سے علم نفسیات کے متعارف کیے جانے اور ارتقا کے بعد ملتی ہے۔اس علم کو تحریک صنعتی اور سائنسی انقلاب نے دی جس نے حالیہ وقت میں انسان کے اندروں میں ایک خلا پیدا کیا۔ان کی وجہ سے انسان کا روحانی اور مادی وجود متزلزل ہو کے رہ گیا۔باوجود کہ ترقی پسند تحریک نے اس خلا کو پر کرنے کی سعی کی لیکن یہاں بھی فرد کو وہ پذیرائی نہیں ملی جو اس تحریک کے زیرِ اثر سماج کو ملی۔یہ تحریک بھی اس حقیقت کا ادراک نہیں کرسکی کہ جب تک فرد کی ذہنی حالت پختہ نہ کی جائے اور اسے سمجھا نہ جائے، سماج زوال اور ابتری کی طرف ہی گامزن ہوتا رہے گا۔اسی حقیقت کے پیشِ نظر ادب میں انسانی فطرت کی گرہ کشائی کو محور ٹھرایا گیا اور بتایا گیا کہ ادب اس نوعیت کا ہو جو انسانی شعور کا عکاس ہو اور اپنے اندر مکمل حقیقت کو سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔نفسیاتی تنقید ان ہی خیالات کی وجہ سے وجود میں آئی۔

ولیم جیمس علمِ نفسیات کے اگرچہ بنیاد گزار تصور کیے جاتے ہیں تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس علم کو مزید بلندی اور مرتبہ فرائڈ جیسی شخصیت نے بخشا۔اس نے تحلیلِ نفس کا نظریہ دے کر علمِ نفسیات میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔اس نظریہ کا جو اصل منشا ہے وہ ذہن میں چھپی ہوئی باتوں کا پتا لگانا ہے۔ابتداً تحلیلِ نفس کو بغرضِ طریقۂ علاج عملایا گیا لیکن بعد ازاں جدید ادب میں بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔

فرائڈ کا نقطۂ نظر ہے کہ انسان خواہشوں اور جبلتوں کا مرکب ہے، اس نے جنسی جبلت کو اہم ترین شئے بتایا، جو دورِ طفولیت سے ہی انسان میں نہاں ہوتی ہے۔اسکے نزدیک صرف اسکی صورت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔اس جنسی قوت کو فرائڈ نے لبیڈو کا نام دیا۔اس نے صرف محبت کی اُلجھن کو ہی نہیں بلکہ عصبی انتشار کو بھی جنسی رغبت سے منسلک کر دیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان کی جو خواہشیں مکمل نہیں ہو پاتیں وہ لاشعور

کے دفتر میں چلی جاتی ہیں۔ وہ خواہشیں ہمیشہ اس تاک اور جستجو میں لگی رہتی ہیں کہ کب انکا اخراج و اظہار ہو۔ بعض صورتوں میں ان کا ارتفاع سماج میں رائج قابلِ قبول طریقوں سے ہوتا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ فنکار کبھی ان تشنہ خواہشوں کو فن کے ذریعے سے پیش کرتا ہے۔

فرائڈ کے خیالات کے نتیجے میں ادب میں دو طرح کے رجحانات وجود میں آئے۔ پہلے فکری نوعیت کے رجحانات ہیں جن کے ذریعے سے وجود اور جنس کے ابہام کے زیر اثر رجحانات کو فروغ ملا۔ مثلاً طفلی حسیت، تلاشِ پدر، عہدِ طفلی کی جانب مراجعت، خواب اور علامتِ خواب کا اطلاق، اوڈیپس کامپلکس وغیرہ۔ دوسرے تکنیکی نوعیت کے رجحانات ہیں، جن کے ذریعے سے شعور کی رو، آزاد تلازمۂ خیال، داخلی خودکلامی، علامت نگاری، تجریدیت، سرریلزم وغیرہ۔ اس کے نتیجے میں فن کے مواد اور ہیئت پر کافی گہرا اثر پڑا۔ فرائڈ کے تحلیلِ نفس کے نظریہ سے شعور کی رو کی تکنیک ادب میں برتی گئی۔ اس کے زیرِ اثر ایسی نوشتیں وجود میں آئیں، جن کی تفہیم الفاظ کے برعکس تفسیر کے ساتھ ضروری سمجھی جانے لگی۔

فرائڈ کے بعد جس شخصیت نے علمِ نفسیات کے ذریعے ادب کو متاثر کیا وہ یونگ ہے۔ وہ شروعات میں فرائڈ کے نظریۂ تحلیلِ نفس سے کافی متاثر رہا لیکن پھر بعد میں اس نے اپنا خود کا نظریہ سامنے لایا، جس کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے، لیکن اگر انکے مطابق فنکار کی بات کریں تو وہ فنکار کو دوہری شخصیت (نفسیاتی اور تخیلی اعتبار سے متصف کردار کا مالک) بتاتا ہے اور اجتماعی لاشعور کو عمل کا مرکز۔ یعنی جب کوئی فرد شعور کو وقت کی حرکت کے موافق ڈھالنے میں ناکام رہتا ہے تو اجتماعی لاشعور متحرک ہو جاتا ہے اور فنکار اس کے توسط سے انسان کی ان شدید خواہشات کا اظہار کرتا ہے جو اس دور کی کمیوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہو۔

ایڈلر کے نظریات نے بھی علم نفسیات کے دوش بدوش ادب پر بھی گہرے اثرات کی چھاپ چھوڑی۔ اس کے مطابق ادب اور فن احساسِ کمتری کے ازالہ کا ذریعہ ہیں جس کو عمل میں لاتے ہوئے ادیب اپنے ذہنی اور جسمانی احساسِ کمتری سے نجات پانے کی کوشش کرتا ہے۔ فرائڈ ادیب کو اس سبب سے نیوراتی کہتا ہے۔ اس نے تحلیلِ نفس کی مدد سے فنکار کا نیوراتی ہونا بخوبی ثابت کیا۔ اسکا مزید ماننا تھا کہ تخلیقی عمل نیوراتی عمل ہے جس کا استعمال فنکار بوقتِ تخلیق کرتا ہے لیکن بعد ازاں وہ حقیقی دنیا سے اپنا

تعلق قائم کر لیتا ہے۔اسکی نظر میں فی الواقعہ تخلیقی عمل کا محرک لاشعور ہے۔فنکار خود کی لاشعوری خواہشوں کوفن کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے،جس سے وہ قدرے آسودگی محسوس کرتا ہے۔فنکار اور ادیب کا لاشعور ایک ہی وقت میں عقل کے تحت بھی ہوتا ہے اور اسکے فوق بھی۔اسکے نزدیک بعض ادیب سادیت پرست ہوتے ہیں جو تکلیف دے کر مزہ حاصل کرتے ہیں،یعنی ایذا پسندی انکی طبیعت میں رچ بس گئی ہوتی ہے۔وہ سماج سے ایسا برتاؤ روا رکھتے ہیں جو باغیانہ طبیعت پر مبنی ہوتا ہے اور اسی کے مسلسل اثر اور انتہا سے وہ نیوراسس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔لہذا اس کی نظر میں نیوراتی وہ ہے جو لاشعوری طور سے اپنے دفاعی عمل کا استعمال کرے۔ادیب کی دیگر نیوراتی علامتوں میں بھی یہی طریقہ اسکے بقول پس پردہ،کار پرداز رہتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جہاں تک ادب اور نفسیات کے باہم رشتے کا تعلق ہے تو نفسیات بہت حد تک تجزیاتی نوعیت کا علم ہے۔اس علم کی بدولت ادب اور فن کے تخلیقی عمل میں زیادہ توضیح ہوئی ہے اور نئے ذخیرۂ اصطلاحات عطا ہوئے ہیں جس کی وجہ سے تخیلی کردار کا تجزیہ زیادہ سریع الفہم ہو گیا ہے اور بہت سی نہاں حقیقتیں کردار کے لاشعور سے دریافت کر لی گئی ہیں۔نتیجتاً اب فن شخصیت کا پردہ نہیں رہا بلکہ اس سے ادیب کی شخصیت اور مترشح ہوگئی۔نفسیاتی پیچیدگیوں کی دریافت اور سلجھاؤ میں نفسیاتی تنقید اہم کام سرانجام دیتی ہے۔نفسیاتی تنقید نگار اس ادب کو نفسیاتی ادب بتاتے ہیں جس میں تحلیلِ نفس،تحت الشعور،لاشعور،اجتماعی لاشعور،شعور کی رو،احساسِ کمتری،جنسی نفسیات،نرگسیت،داخلیت،علامت خواب،سرریلزم وغیرہ کے آثار پائے جائیں اور جن سے کرداروں کے اندرون خانہ پہنچ کر ان کے ذہنی کشمکشوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے۔خودنوشت ادب میں واحد ایسی صنف ہے جو خودنوشت نگار کو نزدیک سے جاننے کا بہترین ذریعہ فراہم کرتی ہے۔مذکورہ بالا سارے اوصاف اس صنف میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔خودنوشت سے نہ صرف مصنف کی نفسیاتی گرہوں اور اُلجھنوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ یہ کسی عہد کی نفسیاتی کشمکش کی گرہیں کھولنے میں بھی مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔یہ ادیب،ادب اور عہد کی نفسیات کی فہمائش کا آسان اور کارآمد ذریعہ ہے۔

اس مقالے میں ۱۹۴۷ء سے ۲۰۰۰ء تک ،باب سوم اور چہارم کے تحت جن خودنوشتوں کومنتخب کیا گیاہے، انکا مختصر تعارف وتجزیہ بالترتیب حسب ذیل درج کیا جارہا ہے:

یادوں کی بارات: اُردو میں جتنی بھی خودنوشتیں منظرعام پرآچکی ہیں ''یادوں کی بارات'' ان میں نفسیاتی اعتبار سے اس لیے بھی اہم ہے کیونکہ اس میں سب سے زیادہ نفسیاتی کشمکش اور گرہوں کی نقاب کشائی ملتی ہے۔ جوشؔ جیسی عبقری اور پہلودار شخصیت کے نفسیاتی مطالعے کے لیے ''یادوں کی بارات'' سے بہتر کوئی اور دوسرا ماخذ نہیں ہوسکتا ہے۔ اس خودنوشت میں انکی تہہ دار شخصیت کا ہر رخ بے حجاب نظر آتا ہے۔ پونے آٹھ سو صفحات پر مشتمل پوری کتاب مختلف نفسیاتی کشمکشوں اور تضادات کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ ان کی متضاد اور نفسیاتی کشمکش کی حامل شخصیت کا اس سے بین ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کے کلام کے مجموعوں کے نام بھی تضاد اور کشمکش کا سراغ دیتے ہیں۔

ان کی خودنوشت کے مطالعے سے قارئین کو جن متنوع نفسیاتی کشمکشوں کا مشاہدہ ہوتا وہ نرگسیت، خود پر طنز، خودنمائی، انسان دوستی ونسلی برتری، جنسی نفسیاتی دباؤ اور ارتفاع، انانیت، لادینیت، مذہبی محاسبہ ومخمصہ، زہد ورندی، تعقل پسندی اور اوہام پرستی، ترک وطن کا رنج اور وطن کی محبت، خشم ناکی اور رقیق القلبی، ماضی پرستی اور حال سے بیزاری، مبالغہ آمیزی اور طنز و استہزا، عشق بازی اور ازدواجی ناآسودگی، ایڈی پس گرہ اور مساکیت وغیرہ ہیں۔ ان باتوں کا انہیں خود بھی احساس تھا اس لیے وہ خود کو مجموعہ اضداد کہتے ہیں۔

جوشؔ اس زمانے اور ماحول کی پیداوار ہیں جس میں شعری وشاعری کا بگل ہر طرف بج رہا تھا۔ ایسے شعری ماحول سے انکی طبیعت کو کیوں نہ تحریک ملتی؟ علاوہ بریں اس عہد میں سیاسی اتھل پتھل بھی زور وشور سے ہو رہی تھی۔ اشتراکیت کا پرچار ہو رہا تھا، سامراجی قوتیں گھٹنے ٹیک رہی تھیں۔ شہنشاہیت کی دیواریں منہدم ہو رہی تھیں۔ سیاسی انقلاب کی صدائیں ہر جانب سے سنائی دے ری تھیں۔ مغلیہ اور انگریز سلطنتوں کے عروج وزوال کے مناظر آنکھوں میں رقص کر رہے تھے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی چکا چوند سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ایسا انقلابی اور پُر جوش ماحول، جوشؔ کو جوش کیوں نہ دیتا اور بناتا؟

وراثت Heredity کے عناصر اور اجتماعی لاشعور بھی ہر انسان کی شخصیت کی تعمیر و تخریب میں کارفرما رہتے ہیں۔ چنانچہ زمیندارانہ اور جاگیردارانہ کج کلاہی ان کے مزاج میں بھی رچ بس گئی تھی۔ خودنوشت کے مطالعہ کے دوران بار بار جوشؔ کا اپنے خاندانی حشمت و شوکت کا تذکرہ کرنا اور نسلی افتخار میں مبتلا دکھائی دینا اسی سوچ کو ظاہر کرتا۔ برہنہ گفتاری، انانیت، جنسی کج روی، غصّہ و رحم، شیعت کی طرف میلان جیسی خصوصیات کو بھی انھوں نے وراثتاً حاصل کیا تھا اور عیش پسندی، سیاست و انسان دوستی، دیوانگی و سرشاری، فرنگ کی نفرت اور اودھ کے شاہان سے لگاؤ جیسے عناصر اس ماحول کی دین تھے۔ ان عناصر سے جو شخصیت ابھر کر سامنے آئے گی اسے مجموعہ اضداد تو ہونا ہی تھا! انہوں نے جس انداز سے عورت کا ذکر خودنوشت میں کیا ہے اس کے مطابق عورت کی اس سے زیادہ وقعت نہیں کہ جب چاہیں اسکا استحصال کر کے اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑا جائے اور جب دل کرے اس سے نفس کی آگ بجائی جائے۔ وہ خودنوشت میں اپنی شہوانی فتوحات اور امرد پرستی کا نقارہ جس انداز میں بجاتے ہیں، اس سے ان کی یہ منشا بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی نسلی برتری اور پٹھان خون کی مردانگی باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہ رویہ انکے انسان دوستی کے برخلاف ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔

'یادوں کی بارات' کے مطالعے کی روشنی میں جوشؔ کی ایک اور تضاد بیانی کی طرف بھی دھیان جاتا ہے۔ خودنوشت میں ان کے اشرافی کردار اور ترقی پسند نظریات کی تبلیغ و حمایت کے مابین تصادم نظر آتا ہے۔ جوشؔ عمر بھر ترقی پسند اور اشتراکیت کے نظریے سے قولاً دست بردار نہیں ہوئے۔ انکی شاعری کا متعدد بہ حصّہ اس نعرے پر مبنی ہے لیکن عمر کے آخری پڑاؤ پر جب وہ اس خودنوشت کو لکھ رہے تھے تو اپنے اجداد کے شاہانہ جاہ و جلال کے قصّے قلمبند کرتے ہوئے وہ معاً یہ بھول جاتے ہیں کہ جاگیرداری کا تصور نہ صرف اشتراکیت کے برعکس ہے بلکہ شخصی آزادی کے تصور پر بھی کاری ضرب ہے۔

خودنوشت میں ان کے مذہب کی طرف میلان اور اسکے بعد مذہب کے قلادے کو اتار پھینکنے کے منازل کا ذکر تفصیل کے ساتھ مرقوم ملتا ہے۔ وہ کبھی خدا کے وجود کا اقرار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی وجودِ خداوندی سے منکر ہو جاتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ بعض موقعوں پر ہم انہیں اقرار و انکار کے دو کروں کے بیچ میں بیٹھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس پیچیدہ نفسیاتی کیفیت کے پس پشت جن عناصر کا ہاتھ دکھائی

دیتا ہے وہ انانیت، خود پرستی اور جنسی ہیجان وکج روی کو سمجھا جاسکتا ہے۔ انکے یہاں اس دہریت مزاجی کی اور کوئی فلسفیانہ اور منطقی توجیہ نہیں ملتی۔ جیسا کہ بعض ملحدوں و مادہ پرست فلسفیوں نے اپنے کفر و الحاد کی بنیاد سائنس و فلسفہ پر رکھی ہے۔ جوشؔ جب ذات باری تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہیں تو اس وقت ہمیں ان میں حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے یہاں ایک ممکنہ صورت انکار کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تسکین بلا مواخذہ چاہتے ہیں اور ہر جواب دہی سے بچنا چاہتے ہیں۔ ان کے اس کفر و الحاد کی ایک اور وجہ شخصی خدا کا تصور ہے، جو انکے ناپختہ ذہن کا تراشیدہ تھا۔ دنیا میں لوگوں کے آلام و مصائب اور طاقت کے ناتقی کو کچلنے اور ظلم و بربریت پر خدا کے خاموش رہنے کی جب انہیں کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی تو وہ احتجاجاً انکار کرنے کی گستاخی کر بیٹھتے ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ مکمل اس عقیدہ پر محکم ہوں، وہ اندرونِ خانہ اقراری بھی ہیں۔ وہ اس حوالے سے ایک عجیب سی کشمکش اور بھنور میں گھرے نظر آتے ہیں۔

''یادوں کی بارات'' میں انکی ترکِ وطن کے واقعہ سے پیدا شدہ نفسیاتی کشمکش بھی قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہے۔ انہوں نے دوستوں کی فہمائش پر اور اپنی تہذیبی شناخت کو قائم رکھنے کے لیے اور بالخصوص اپنی آئندہ کی نسلوں کی تہذیبی اور لسانی مستقبل کی حفاظت کے لیے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن توقع کے بالکل برعکس جب وہاں کی زمین ان پر تنگ پڑ گئی اور آسمان برہم ہوگیا اور جن آسائش کی طمع لے کے وہ پاکستان چلے آئے تھے ان تمام خوابوں کے محل پے در پے زمین بوس ہونے لگے۔ ہندوستان کی آسائش اور اپنے آباؤ اجداد کے جاہ و حشم کے تصور کا موازنہ جب وہ ہجرت کے بعد کی زندگی سے کرتے ہیں تو انکے یہاں نفسیاتی کشمکش کی ہولناک تصویر نکل کر سامنے آتی ہے۔ ان کی اس حالت کے پس پشت انکی انا اور غیرت کا دخل قرار دیا جاسکتا ہے۔

جوشؔ ''یادوں کی بارات'' میں اپنی مردانہ وجاہت، قادر الکلامی، حسب و نسب اور اشرافیت کا ذکر جابجا کرتے ہیں۔ وہ خودخونوشت میں خود پسندی میں انتہا کو پہنچے ہیں۔ انہیں اپنی ذہانت اور خوبصورتی پر بے انتہا فخر تھا۔ انکے سارے معاشقے بھی کامیاب ہی رہے تھے اسی وجہ سے انکی شاعری نشاطیہ پہلو سے زیادہ ابھر کر نظر آتی ہے۔ میرؔ و یاسؔ والا عشق انکا نہ تھا، نہ انہوں نے ویسی زندگی بسر کی تھی۔ ہجر کی صعوبتیں

جھیلنے کا ان میں حوصلہ نہ تھا۔ وہ بسمل ہونا نہیں، کرنا جانتے تھے۔ وہ نازِ معشوقانہ اٹھانے والے نہیں بلکہ اٹھوانے والے لوگوں میں سے تھے۔ متذکرہ بالا خوبیوں اور خصوصیات نے ان کے اندر نرگسیت اور خود پرستی کے عناصر کو جنم دیا۔ یہی سبب ہے کہ خودنوشت میں انکی خوبیوں کا برملا اظہار تکرار کے ساتھ ملتا ہے۔ انہوں نے عمر کی آخری منزل میں اس خودنوشت کو رقم کیا ہے۔ اس خودنوشت کے محرکات میں ایک بڑا نفسیاتی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ نرگسیت زدہ تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ وہ کبھی بھی فراموش کیے جائیں۔ وہ خود کے عاشق تھے اور لوگوں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ وہ بھی انہیں بھرپور چاہیں اور یاد رکھیں۔ وہ لاشعور میں یہ خواہش رکھتے تھے کہ عام لوگوں سا حشر انکے ساتھ نہ ہو، اس مقصد کی خاطر انہوں نے ارادۃً کچھ ایسے شگوفے بھی 'یادوں کی بارات' میں چھوڑے ہیں جن کی قلعی اگر چہ ماہر القادری، عبدالماجد دریا آبادی، پروفیسر گیان چند جین وغیرہ نے کھولی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ چاہتے تھے، ان کے بعد بھی موشگافیوں کے کواڑ کھلے رہیں اور لوگ ان کا نام لیتے رہیں۔

مختصر یہ کہ ''یادوں کی بارات'' ایک ایسی متضاد خودنوشت ہے جو جوشؔ کی مختلف نفسیاتی کشمکشوں کی طرف راہ نمائی کرتی ہے، ساتھ ہی یہ اپنے عہد کی نفسیاتی کشمکش سے بھی روشناس کرا کے اس کی گرہیں کھولنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

بوئے گل نالۂ دل، دود چراغِ محفل: ''بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل'' آغا شورش کاشمیری کی زیست پر مبنی ایسی خودنوشت ہے جس میں موصوف اور ان کے عہد کی نفسیاتی کشمکش کی ایک دنیا موجزن ہے۔ یہ صرف ایک فرد کی نہیں بلکہ اُس پورے معاشرے اور عہد کی تاریخ ہے جسکے آئینے میں سب یکجا جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ آغا شورش بیک وقت مشہور و معروف شاعر، دوراندیش سیاست دان، شعلہ نوا خطیب اور دلیر صحافی تھے۔ وہ ان سب میدانوں میں شہسوار بھی تھے اور شورش بھی پیدا کرنے والے تھے۔

''بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل'' ۱۹۷۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی شورش صاحب کی زندگی کے اہم واقعات، انکے سیاسی، مذہبی، قید و بند کی صعوبتوں اور افکار کی ترجمان ہے۔ اس خود نوشت کے نام کو مصنف نے غالبؔ کے ایک مصرعہ سے معنون کیا ہے۔ انکا خیال ہے کہ انکی پوری زندگی کا

خلاصہ اس مصرعہ میں چھپا ہوا ہے۔اس کے آئینے میں انکا خود کو دیکھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ موصوف کی زندگی کشمکش کا گہوارہ ہے۔ اس خودنوشت کو تصنیف کرنے کے پس پشت جو محرکات ہیں وہ جہاں انکی گہری نفسیاتی کشمکش اور محرومی کو ظاہر کرتے ہیں وہیں اسکا تصنیفی عمل بھی ان کی سخت قسم کی اُلجھن کو آشکار کرتا ہے کیونکہ وہ ایک تکمیلیت پسند ادیب اور شخصیت تھے۔

شورش کاشمیری اپنی خودنوشت میں اپنے بچپن کی تعلیمی کشمکش سے بھی پردہ اُٹھاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ نہایت پڑھنے لکھنے کے شوق کے باوجود عسرت کی وجہ سے انہیں زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ انہیں محض میٹرک پر ہی اکتفا کرنا پڑا لیکن مروجہ طریقے کے برعکس انکی تحصیل علم کی پیاس زنداں کے کنویں سے پوری ہوتی رہی۔

آغا شورش نے اُس دور میں آنکھیں کھولیں جس میں ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ انگریز ظلم و بربریت کی نئی نئی داستانیں رقم کر رہے تھے۔ فتنہ و فساد کو ہر طرف سے ہوا دی جا رہی تھی۔ ان سب اسباب کا انکی حساس طبیعت پر اثر پڑنا لازمی عمل تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، انکے دل و دماغ میں اپنے گرد و نواح میں ہو رہی ناانصافیوں اور ظلم و جور کی وجہ سے کافی گہرا اور منفی اثر پڑا۔ ان کے دل میں انتقام کا لاوا اُبلنا شروع ہوا اور آنکھوں میں نفرت کا طوفان رقص کرنے لگا۔ اس نفرت کی آگ میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہا۔ ان باتوں نے انکے اعصاب میں شورش پیدا کی اور شورش مزاجی کی نیو ڈالی۔

انکی بچپن کی زندگی جسے شورش صاحب ''بوئے گل'' سے تعبیر کرتے ہیں ایسے گل کی طرح ہے جس کی خوشبو چُرا لی گئی ہو۔ اس ''بو'' کی محرومی کا احساس انہیں تاعمر رہا، یہ ''بو'' جوانی میں بھی نالۂ دل کی صورت میں نکلتی رہی۔ ان کی ابتدائی عمر کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ بچپن میں شدید قسم کی احساس محرومی اور کشمکش کے شکار رہے ہیں۔ پھر چاہے وہ والدین کی محبت کی کمی کا احساس ہو، عسرت و افلاس کا غم ہو یا زمانے کی ستم گری ہو، یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ وہ زمانہ سخت لایقینی صورت حال، مایوسی و ناکامی اور ظلم و جبر سے پُر تھا، ان حالات کا گہرا اثر معصوم ذہنوں کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ ان سب عناصر نے انکی حساس طبیعت پر برا اثر ڈالا اور مستقبل کی شخصیت کی تشکیل کی۔ مذکورہ بالا اسباب ایسے ہیں جو کسی بھی حساس فرد کو متاثر کرکے باغی پن اور سخت مزاجی کی دہلیز کی طرف

دھکیل دینے کے لیے کافی ہیں۔

اب بات شورش کے دور جوانی کی جسے وہ ''نالۂ دل'' سے تشبیہ دیتے ہیں، تو واقعتاً یہ دور بھی سخت قسم کی دشواریوں اور چیلنجوں سے بھرا ہوا تھا۔ خودنوشت کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انہیں جوانی بھر مسلسل مصائب کا سامنا کرنا پڑا، جس کا اظہار نالوں کی صورت میں انکی سوانح میں ملتا ہے۔ ان نالوں میں کچھ نالے بچپن کے ہوا ہو جانے کے حزن و ملال پر مبنی ہے، کچھ نالے جوانی میں محبوب کی محبت اور موت سے متعلق ہیں۔ کچھ دیگر عزیز اقارب کی جدائی کے باعث نکلے ہیں، چند قید بند کی صعوبت سے وابستہ ہیں، بعض مفید صحبتیں چھن جانے کے رنج کی وجہ سے ہیں برآمد ہوئے ہیں، کئی نالے الحاد و مراجعت کی کشمکش اور اسکے بعد ناموس رسالت پر حملوں کی وجہ سے نکلے ہیں، بہت سے نالے فسادات اور تقسیم کی رنج کے سبب خارج ہوئے ہیں، متعدد نالے عقیدتوں کے بُت ٹوٹنے کی وجہ سے نکلے ہیں اور ان میں چند ایسے بھی نالے ہیں جو زمانے کی ناقدری کی بنا پے خارج ہوئے ہیں۔

آغا شورش کی جوانی میں تقسیم ہند جیسا عظیم سانحہ بھی پیش آیا۔ اسکے بعد پھر فسادات کا نہ تھمنے والا سلسلہ بھی چل نکلا۔ انکی شدید حساس طبیعت اس سے نہایت متاثر ہوئی۔ یہی سبب ہے کہ ہم خودنوشت کا بیشتر حصّہ فسادات اور تقسیم کے اندوہ ناک واقعات پر مشتمل پاتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ ان وقعات نے ان کے ذہن کو کس قدر جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا اور کیسا ارتعاش پیدا کیا تھا۔

خودنوشت کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے ان میں خودستائی اور نرگسیت پسندی کے عناصر بھی پیدا ہو گئے تھے۔ آغا صاحب خودنوشت میں اپنی مقررانہ صلاحیتوں پر فخریہ انداز میں جا بجا نقارہ بجاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ خود کی ذات منوانے کے لیے ہر طرح کی سعی کرتے ہیں۔

آغا شورش کی خودنوشت لکھنے کے پیچھے جو محرکات ہیں وہ ان کی نفسیاتی کشمکش کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی احساس کمتری کی تلافی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں تا کہ وہ اسے احساس برتری میں بدل سکے اور اس سے خود کو تسکین پہنچا سکے۔ خودنوشت میں کثرت کے ساتھ انکی خطابت، شجاعت، سیاست، سخاوت، مصاحبت، رفاقت اور بغاوت کے مبالغہ آمیز تذکروں کا پایا جانا، اسی اُلجھن کو ظاہر کرتا ہے۔

آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریا آبادی ایسی جامع الحیثیات اور قاموسی شخصیت کی حامل ذات ہے، جنہیں مذہب، عمرانیات، فلسفہ، تاریخ اور تہذیبی زندگی کے تمام شعبہ ہائے پہلوؤں پر کامل دسترس حاصل تھی۔ ''آپ بیتی'' انہی کی بیاسی سالہ زندگی پر محیط خودنوشت ہے جو ۱۹۷۸ء میں منظرعام پر آئی۔ ۴۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ سنجیدہ نوعیت کی آپ بیتی خودنوشت نگاری کی روایت میں ایک اہم اضافہ شمار ہوتی ہے۔

مولانا دریا آبادی کی زندگی میں شروع سے آخر تک ایک نمو، ارتقا پزیری اور تحرک کا تسلسل ملتا ہے۔ ان کی خودنوشت زندگی کے گوناگوں تجربات ومشاہدات کا البم ہے۔ اس میں انکی پیدائش، بچپن، خاندانی حالات، تعلیم وتربیت، جنسی وازدواجی زندگی، سیاست، تقسیم وفسادات، مذہب والحاداور نیرنگِ زمانہ پر مبنی حالات و واقعات کی بسیار تفصیل وتنقید ملتی ہے۔ اس طرح یہ خودنوشت خارجی اور داخلی کشمکشوں کا ایک وسیع دفتر اپنے اندر سموئے ہوئی ہے۔

مولانا ماجد کی خودنوشت کے مطالعے سے قارئین پر جو بات آغاز میں ہی مترشح ہوتی ہے وہ مصنف کے پیش نظر اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر کا مقدم ہونا اور احساس ندامت وگناہ ہے۔ نفسیاتی رو سے اگر اسکی توجیہ تلاش کی جائے تو یہ سمجھ آتا ہے کہ، مصنف کو اپنے سابقہ اعمال، محرومیوں، احتیاج، دنیا کی اصل حقیقت کے کھل جانے کے احساس اور زندگی کے تلخ تجربات سے جو سبق حاصل ہوا تھا، اُسے وہ قارئین کے ساتھ ساجھا کر کے اپنے من کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ انکا خودنوشت کے محرک کے بارے میں خود اظہار خیال ہے کہ یہ اعتراف جرم اور قارئین کے لیے عبرت ونصیحت کے لئے لکھی گئی ہے۔

مولانا دریا آبادی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرداخت پائی وہ برطانیہ اور ملکہ وکٹوریہ کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط واقتدار مستحکم تھا، صرف سیاسی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ علمی، تعلیمی، تہذیبی، تمدّنی غرض دنیوی زندگی کے ہر شعبے میں اُن کا برتری حاصل تھی حتیٰ کہ دینی زندگی کے بھی مختلف شعبوں میں وہ زور آور تھے۔ مسلمان ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور اسکے ہولناک نتائج کے بعد احساس کمتری کے شکار ہوگئے تھے اور خیریت اسی میں سمجھتے تھے کہ ہاں میں ہاں ملائے جائیں۔ جو طبقہ مسلمانوں میں آسودہ حال تھا ان میں اکثریت اخلاقی پستی کی شکار ہوگئی تھی۔ خودنوشت نگار اسی ماحول

کے پروردہ تھے۔وہ خودنوشت میں ان طبقات کی تفریق و عدم مساوات، بد اخلاقی، بدعنوانی، مذموم اشرافیت اور جاگیردارانہ نظام کی قلعی کھولتے ہیں۔اس سے بچپن میں ہی ان کے حساس ہونے کا سراغ ملتا ہے۔مولانا خود ایک نہایت متمول اور معیاری گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور انہیں یہ موقع ملا تھا کہ وہ جاگیردارانہ سماج کی پیدا کردہ مصنوعی اور کھوکھلی زندگی کا موازنہ سماج میں بس رہے دوسرے طبقات کے ساتھ کر سکے۔

ماجد صاحب کے لاشعور میں یہ بات شعور کی آنکھ کھلنے کی ساتھ ہی رچ بس گئی تھی کہ انکی شکل و شباہت بہتر نہیں ہے۔دوسری جانب وہ فطرۃً کم گو بھی واقع ہوئے تھے۔ان وجوہ کے بسبب وہ خلوت نشینی کی طرف زیادہ مائل رہتے تھے۔ان محرکات کا جومنفی اثر انکے لاشعور پر پڑا اس نے احساس کمتری کی کشمکش کا در کھول دیا۔اس کے فوری نتائج جو بچپن میں برآمد ہوئے وہ انکی طبیعت میں برگشتگی اور ضدی پن کا آجانا تھا۔انہیں گھر کے ملازمین پر ایک طرح کا اختیار حاصل تھا۔وہ اپنا سارا انتقام اور فرسٹریشن وہاں موجود ان ماتحتوں پر نکالتے تھے۔یہ ردعمل انکی احساس کمتری کی تلافی کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ خودنوشت کے حوالے سے مصنف کو مرکزی حیثیت دے کے اگر اس دور کے اشراف و امراء کے اجتماعی لاشعور کو بھی سامنے رکھا جائے تو اس زمانے، خاص کر لکھنؤ کی معاشرتی اور طبقاتی کشمکش کے ساتھ ساتھ خودنوشت نگار کی نفسیاتی کشمکش پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ واضح ہوتا ہے کہ ماحول کا کسی شخص کی ذہنی تشکیل میں کتنا اہم رول رہتا ہے۔

''آپ بیتی'' کے حوالے سے اگر ماجد دریا آبادی کی جنسی کشمکش پر نظر ڈالیں تو یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ کس طرح وہ ایک طرف اپنی جسمانی تبدیلی کی وجہ سے خواہشات (ایڈ) اور ماحول کی وجہ سے برانگیختہ ہو رہے تھے تو دوسری جانب خاندانی شرافت وتربیت یا فوق انا اپنا اثر دکھا رہے تھے۔دوسری شادی کی طرف خیال مرتکز ہونا دراصل اسی Frustration کا روپ تھا۔ایسے برتاؤ کو ہم انکا Ego Depletion بھی کہہ سکتے ہیں۔

اسکے بعد اگر انکی مذہبی کشمکش کی بات کی جائے تو قریب دس سال تک وہ کفر والحاد اور بے دینی کے شکنجے میں جکڑے رہے۔اسکے بعد جو اشخاص انکی ایمانی مراجعت اور شخصیت سازی میں معاون بنے،

ان میں خاص طور پر مولانا محمد علی جوہر اور مولانا اشرف علی تھانوی کی کاوشوں کا دخل وہ مانتے ہیں۔

غرض کہا جاسکتا ہے کہ عبدالماجد دریا آبادی کی ''آپ بیتی'' خارجی معاملات کی کشمکش کی بہتات کے ساتھ ساتھ داخلی دنیا کی کشمکش پر مبنی وافر نفسیاتی مواد فراہم کرتی ہے، جو خودنوشت نگار اور اس زمانے کی نفسیاتی کشمکش کی گرہیں کھولنے میں اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

سلسلۂ روز وشب: ''سلسلۂ روز وشب'' اُردو کی مشہور فکشن نگار اور ادیبہ بیگم صالحہ عابد حسین کی خودنوشت ہے۔ اسے پہلی بار مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا گیا۔ صالحہ اسکے علاوہ بہت ساری کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں۔ یہ خودنوشت انکی طویل سفرِ حیات کی روداد ہے۔ اس میں انکی زندگی کے نشیب وفراز سے بھرپور واقعات کی گہری عکاسی ملتی ہے۔ یہ آپ بیتی صرف حالات و واقعات کی خشک کھتونی نہیں بلکہ اس سے انکی زندگی کے ساتھ ساتھ انکے ادب اور اس ماحول سے جڑے اہم محرکات کی گرہ کشائی ملتی ہے۔ انکی یہ خودنوشت پچیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اسے لکھنے کی شروعات سن باون میں ہی ہوئی تھی لیکن چند وجوہ کی بنا پر دوبارہ اسے اسّی کی دہائی میں لکھنا شروع کیا گیا۔ ان پچیس ابواب میں انکی نجی زندگی، انکے خاندان کے افراد اور اس ماحول پر تفصیلی طور پر خامہ کشی ملتی ہے۔ اسے تحریر کرتے وقت اکثر مقامات پر خودنوشت نگار جذباتی بھی ہوجاتی ہیں جو انکے شدید حساس ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

صالحہ عابد کا ادب اور بلخصوص یہ خودنوشت کسی الہام کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ انکے گہرے لاشعور کا آئینہ دار ہے۔ اس کے پس پردہ ان کا فلسفہ حیات کارفرما ہے۔ انکے تجربات وحدثات کا ایک طویل سلسلہ کھڑا ہے۔ ان کی تربیت و ماحول کا اثر ہے۔ ان عناصر نے جس طرح کی شخصیت پروان چڑھائی، اسی کا آئینہ دار انکا ادب ہے۔ ان کی تحریر میں جو زندگی کی حقیقی تصویر، اخوت ومحبت، سماجی اصلاح اور ملک کی تہذیبی اقدار سے وابستگی کا درس ملتا ہے وہ ان ہی تجربات و ماحول کی دین ہے۔ انکے ادب پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ اس میں جنس و رومان کا عکس دکھائی نہیں دیتا ہے۔ کہانیوں میں حزنیہ رنگ ملتا ہے اور اداسی کی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ اس کے پیچھے بھی انکی زندگی کے تلخ تجربات وحادثات کے طویل سلسلوں کا ہاتھ ہے اور انکا گہرا لاشعور کارفرما ہے۔

بیگم صالحہ عابد علمی، ادبی اور مذہبی خاندان کی پروردہ تھیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان میں اسکے اثر

سے فوق انا بھی متاثر و مضبوط ہوتا رہا، جس نے ہمیشہ انکی ایڈ پر بالا دستی قائم رکھی اور سماجی اخلاقیات سے باغی ہونے سے بچائے رکھا۔ یہی وجہ ہے ان کے یہاں آدرش کا پرچار زیادہ ملتا ہے۔ اگر چہ یہ صحیح ہے کہ وہ اس حد تک ملتا ہے کہ گراں گزرنے لگتا ہے اور ان کے کردار مثالی نوعیت کے ہو جاتے ہیں تاہم امر واقعہ یہ بھی ہے کہ انکے ارد گرد جو لوگ تھے وہ واقعی بے نفسی اور ایثار کا مظہر تھے۔ وہ ایسی شخصیات تھیں جنکی سماج کی اصلاح اور قوم کی بھلائی میں کافی کاوشیں رہی ہیں، اسی کا لاشعوری طور پر اثر ان میں بھی در آیا ہے۔ وہ اپنے کرداروں میں ان مثالی شخصیتوں کو تلاش کرتی ہیں یا لاشعوری طور سے یہ چاہتی ہیں کہ انکے کردار ویسے ہی عادات و خصائل سے متصف ہوں۔ مصنفہ کی ذات میں، سخاوت، اصلاح اور ہمدردی کے جذبات کا بدرجہ اتم پایا جانا اسی اثر کا نتیجہ ہے۔

صالحہ عابد کے ابتدائی ایام یعنی دور طفولیت کا اگر نفسیاتی اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو انکی شخصیت اور انکے ادب کی تفہیم میں بڑی مدد ملتی ہے کیونکہ بچپن کے حالات ہی انسانی شخصیت کے مستقبل کا تعین کرتے ہیں۔ ان کے ادب میں بھی بچپن کی کشمکش بھری زندگی کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے یا یوں کہنا چاہیے لاشعور بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ بچپن کے حوالے سے ان کے دل میں کئی معاملات کو لے کر حزن و ملال نظر آتا ہے۔ خود نوشت میں مرقوم کئی واقعات اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ ان کے بچپن کو خار دار اور تلخ بنانے کے پیچھے انکے خاندان کے کچھ لوگوں کی اموات کا سخت صدمہ شامل ہے۔ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی عزیز و اقارب کی اموات کا جو غم مسلسل پایا اُس نے انکی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ انکی تحریریں اس بات کی غماز ہیں کہ انکا بچپنا عیش و فراغت کے زیر سایہ بسر نہیں ہوا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان سب کا لاشعوری اثر آخری دم تک ان کی نگارشات سے چھلکتا رہا۔

صالحہ عابد کی دور طفولیت کی کشمکش میں تعلیمی کشمکش بھی نمایاں ہے۔ دور نہانی میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا ذہن پڑھائی لکھائی جیسے کاموں میں لگا دیا۔ اس میں کچھ موافق ماحول نے اپنا کردار ادا کیا۔ انکا گھرانہ چونکہ علمی و ادبی نوعیت کا تھا لہذا گھر کے باقی افراد کے تئیں ان میں مسابقت اور ہمسری کا جذبہ اوائل دور سے ہی اُبھرنا شروع ہوا۔

بچپن کی پُر خار و پیچیدہ گلیوں سے گزر کر جب صالحہ عابد نے جوانی کی وادی میں قدم رکھا تو یہاں

بھی پھول کم اور کانٹے زیادہ پائے۔ یہاں بھی کشمکشوں کا ایک نہ رُکنے والا سلسلہ کھڑا تھا۔ انہوں نے خود نوشت میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان اُمور کو بیان کیا ہے جو انکی کشمکش کا باعث بنے ہیں۔ پھر خواہ وہ داخلی عناصر سے متعلق ہوں یا خارجی معاملات پر مبنی ہوں۔

''سلسۂ روز وشب'' کے مطالعہ سے یہ بات بالکل روشن ہے کہ شادی کے بعد عابد صاحب کے ساتھ انکے تعلقات مجموعی طور پر خوشگوار نوعیت کے رہے۔ ان کے ہاں ایک بچی پیدا بھی ہوئی لیکن اُس نے دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی بند کرلیں۔ شومیِ قسمت اس کے بعد وہ پھر کبھی اُمید سے نہیں ہوئیں۔ خودنوشت میں اس بات سے پہنچے صدمے اور دکھ کا احساس جا بجا ملتا ہے۔ اس محرومی کے شدید رنج نے انکو ہمیشہ گھیرے رکھا اور مسلسل مغموم رکھا۔ انکی کوکھ گو کہ مستقبل میں وجودِ اولاد سے محروم رہی لیکن قدرت نے جو دلِ مادر نوازا تھا، اس نے اوروں کے بچوں کو اپنا کر، جذبۂ مادری کو تسکین دینے کی کوشش کی، مگر باجود اسکے انکے دل میں اس نعمت کی محرومی کی خلش تاعمر موجود رہی۔ اس کا اثر مجموعی طور پر انکی ساری تصنیفات بشمول خودنوشت میں صریح انداز میں نظر آتا ہے۔

الغرض! 'سلسلۂ روز وشب' ایسی خودنوشت ہے جس میں صالحہ عابد کی زندگی کے شب وروز کے نشیب وفراز کی تمام سرگزشت موجود ملتی ہے۔ اس میں انکی ساری محرومیوں، محزونیوں، پریشانیوں، انتشار اور اسکے ساتھ ساتھ انکی جہد مسلسل اور اُبھرنے کی نفسیاتی کشمکش واضح طور پر عیاں ہے۔ اس آپ بیتی کا نفسیاتی مطالعہ انکے ادب کی تفہیم میں اور انکی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک کارگر ذریعہ ہے۔ اس خودنوشت کی اہمیت میں یہ بات بھی اضافہ کرتی ہے کہ یہ اپنے اندر قارئین کے لیے ایسے راہ نُما اصول رکھتی ہے جو اُنہیں بہتر طریق سے زیست کا ہنر سکھانے میں مدد دے سکتی ہے اور بالخصوص درس دے کے یہ سمجھا سکتی ہے کہ آلام ومصائب میں اپنے اعصاب پر قابو پا کے کیسے ایک تعمیری زندگی، بلند حوصلوں کے ساتھ گزاری جاسکتی ہے۔

بُری عورت کی کتھا: کشور ناہید اردو ادب کا ایک ممتاز اور نمایاں نام ہے۔ مشرقی معاشرے اور مسلم متوسط طبقے کی عورتوں کو جس جبر واستحصال، محکومیت اور جذباتی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس پر بہترین خامہ فرسائی اگر عصمت چغتائی کے بعد کسی کے یہاں ملتی ہے تو وہ کشور ناہید کے یہاں نظر آتی

ہے۔کشور ایک حساس اور حقیقت پسند تخلیق کار ہیں۔اندرون اور بیرون ملک کے سیاسی،سماجی حالات اور مسائل جیسے تقسیمِ ہند، سامراجیت ،مذہبی انتہا پسندی،ہجرت اور آمریت جیسے عناصر سے وہ اس قدر متاثر ہو جاتی ہیں کہ انکا قلم دردمندانہ اور بے باکانہ انداز سے اسکی تصویر کشی کرنے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔''بری عورت کی کتھا'' اس لیے جہاں کشور ناہید کی آپ بیتی ہے تو وہیں یہ خودنوشت پوری عورت ذات کی خودنوشت قرار دی جاسکتی ہے۔یہ مصنفہ کی نفسیات کے ساتھ ساتھ اُس پورے معاشرے،زمانے اور بلخصوص عورت ذات کی نفسیات اور انکے جذبات وخیالات سمجھنے کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے۔

''بری عورت کی کتھا'' خودنوشت چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کا مرکزی نقطۂ نگاہ بالخصوص حقوقِ نسواں کی بازیافت اور ان کی اہمیت کے ارد گرد ہی گھومتا ہے۔کشور نے اس میں ابتدائے افرینش سے لے کر تا امروز،طبقۂ نسواں کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان ستم رسیدہ خواتین کی کہانی میں انہیں اپنی کہانی بھی نظر آتی ہے اور اپنے وجود کا عکس بھی کہیں نہ کہیں دکھائی دیتا ہے۔خودنوشت کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انہوں نے تلمیحاتی واستعاراتی لہجے میں اپنی ہی زندگی کے حالات سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔اس تناظر میں دیکھیں تو کشور کے قلم سے لکھا ہر لفظ،انکی نفسیاتی کشمکش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خودنوشت کے ابتدائی صفحات سے ہی یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کی مصنفہ نے صغرسنی سے ہی کس طرح کٹھن اور صبر آزما دور کا سامنا کیا ہے۔انہوں نے کوئی بجز، تامّل اور باک اپنے رشتہ داروں کو یا کسی بھی اذیت رساں شخص کو بےنقاب کرنے میں روا نہیں رکھا ہے۔گھر میں ہو رہے سوتیلے سلوک واستحصال، اقارب کی سردمہری و بےتوجہی اور مختلف محرومیوں کا ذکر انہوں نے بے دھڑک ہو کے کیا ہے۔انہوں نے خودنوشت میں اپنی پیدائش کو گھر والوں کے لیے غیر اہم اور اضافی بوجھ مانتے ہوئے اسے اوائلی کرب میں شمار کیا ہے۔اس سے انکی ذہنی کشمکش کا پتا چلتا ہے۔وہ مزید لکھتی ہیں کہ وہ خوش شکل بھی نہیں تھیں اور انکی صحت بھی اکثر خراب رہا کرتی تھی۔ان محرومیوں نے انکے لاشعور میں ایک ایسے ناسور کی صورت اختیار کی جو ہر وقت انکی تحریروں سے رستا ہوا ملتا ہے۔

کشور ناہید کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا لیکن ستم ظریفی یہ کہ یہاں بھی انہیں بے جا پابندیوں اور حوصلہ شکنیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ خود نوشت میں بیان کرتی ہیں کہ انکے گھر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے دہرے معیارات تھے لیکن دوسرے باقی سب بھائی بہنوں کے برعکس ان میں ہی تعلیم کے تئیں زیادہ دلچسپی تھی۔

اس خود نوشت میں ہم جنس پرستی پر بھی کشور کی لب کشائی ملتی ہے۔ وہ خود کے ساتھ پیش آئے اس طرح کے واقعات اور دیگر جنسی استحصال و ہراسان کیے جانے کی باتوں کا اظہار کہیں دبے لہجے میں تو کہیں بے باکانہ انداز میں کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

کشور کی ازدواجی زندگی کی کشمکش کے بارے میں بات کریں تو وہ سید گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی۔ اس خاندان سے تعلق رکھنے والی کئی عورتوں اور خاص کر اپنی بہنوں کی زبوں حالی ان کے سامنے تھی۔ انکے حساس مزاج میں باغیانہ روح پھونکنے کے لیے یہ بات کافی تھی۔ ان کے اندر اس مشاہدے سے پیدا شدہ داخلی کشمکش نے تب عملی اظہار پایا جب انہوں نے ارادتاً اپنی قوم سے باہر ایک لڑکے کو پسند کیا اور آناً فاناً انکی شادی کر دی گئی۔ اسکے بعد اگرچہ انہوں نے اپنے شوہر کے انتقال تک باوفا رہنے کی اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی لیکن باجود اس کے انہیں حسب توقع وہ الفت و آسودگی اور وفا نصیب نہیں ہوئی جیسا وہ حق رکھتی تھیں۔ شادی کے فوراً بعد ہی انہیں معاش کی فکر بھی اُٹھانی پڑی، ساتھ ہی گھریلو کام کاج کا پورا ذمہ بھی اٹھانا پڑا۔ یوں انہیں کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی تھی۔ اسی دوران انہوں نے اپنے اندر نئے مہمان کو بھی محسوس کیا لیکن تیرگی بخت! یہ مسرور کُن خبر جلدی غم کا پہاڑ بن کر ان پر ٹوٹ پڑا اور وہ حمل ضائع ہو گیا۔ اس دل دوز حادثے کو وہ خود نوشت میں جس کرب آمیز لہجے میں تحریر کرتی ہیں وہ انکی نفسیاتی کشمکش سے پردہ اُٹھانے کے لیے کافی ہے۔

کشور ناہید ملکی اور بین الاقوامی سطح کے سیاسی، سماجی مسائل کا گہرا شعور اور ان پر نظر رکھنے والی ادیبہ ہیں۔ وہ اکثر ان حالات کو نسائی زاویے سے دیکھتی ہیں۔ بعض موقعوں پر مختلف جگہوں کی مظلوم عورتوں کی حالت زار پر قلمی احتجاج کرتے ہوئے کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود کا غصہ باہر نکال رہی ہیں اور در پردہ کہیں نہ کہیں استعاراتی لہجے میں اپنا ہی درد بیان کر رہی ہیں۔ انکے تقریباً سارے

واقعات کا تانا بانا مردوں کے ذریعے عورتوں پر ظلم کے ارد گرد ہی گھومتا ہے۔انھوں نے پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، سومالیہ، گھانا، کشمیر اور فلسطین میں ہو رہے عورتوں کے ساتھ مظالم کو بڑے تلخ اور درد آمیز انداز میں پیش کیا ہے۔

کشور کی مذہبی کشمکش کی بات کی جائے تو کم عمری میں ہی وہ دین کے ایسے سخت تصور اور اطلاق سے متعارف ہوئیں جس نے انہیں مذہب بیزار بننے پر مجبور کر دیا۔وہ بچپن میں دین کی طرف کچھ عرصہ خوف و جبر کی وجہ سے مائل تو ہوئیں لیکن بہت جلد مسلسل بندشیں اور سختیاں انکی طبیعت پر گراں گزرنے لگیں اور وہ جلد مذہب کے تئیں شک وتردد کی شکار ہوئیں اور بعد میں برگشتہ ہوگئیں۔

المختصر !'بری عورت کی کتھا' کشور ناہید کے ساتھ ساتھ پوری صنف نازک طبقے کی سوانح حیات ہے۔ یہ خودنوشت جہاں مصنفہ کی نفسیاتی کشمکش کا پتا دیتی ہے تو وہیں یہ پس پشت عوامل کے ساتھ ساتھ انکی نبرد آزمائی وردعمل کو بھی سامنے لاتی ہے۔اس سے ان کی شخصیت اور فن کی تفہیم میں بہت آسانی ہوتی ہے۔انہوں نے عمر بھر جس ماحول میں زندگی گزاری، جن محرومیوں اور مصائب کا سامنا کیا ہے اور جو ناانصافیاں اور بے قدریاں دیکھیں ان کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انکے یہاں تلخی و بے باکی، باغی پن اور ترش گوئی پیدا ہوگئی۔ان سب عوامل نے انکی شخصیت کی تشکیل کی اور انہیں ''بری عورت'' کا خطاب دلایا۔اپنی احساس کمتری ومحرومی سے نجات پانے کے لیے اور اسکی تلافی و برتری کے احساس کے لیے انہوں نے ''قلم'' کو سہارا بنایا اور اپنے ذہنی خلجان وتشنج کو اس کے ذریعے سے خارج کرنے کی کوشش کی۔لہذا ان کی نفسیاتی کشمکش کو واضح طور سے انکی خودنوشت میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اس آباد خرابے میں: اختر الایمان کے شعری مجموعے اور بلخصوص انکی خودنوشت ان کی نفسیاتی کشمکش کی ساری داستان پیش کرتے ہیں۔عجب اتفاق ہے کہ ان مجموعوں کے اسماء بھی انکی ظاہری اور روحانی کشمکش کو اُجاگر کرتے ہیں۔''اس آباد خرابے میں'' سے بھی مصنف کی بہت سی نفسیاتی کشمکش کی تصویریں اُبھر کے سامنے آتی ہیں، جس سے انکی شخصیت اور انکے فن کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔اِس خودنوشت کا نام انکی ایک نظم ''یادیں'' کے ایک مصرعہ سے لیا گیا ہے۔ان کی یہ نظم بھی مصنف کی نفسیاتی کشمکش کی آئینہ دار معلوم ہوتی ہے۔

''اس آباد خرابے میں'' کا مطالعہ کرتے ہوئے جب ہم اختر الایمان کے دورِ طفولیت کو دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے ہم جس چیز سے روشناس ہوتے ہیں وہ انکے بچپن کے تلخ تجربات و حادثات ہیں۔اس تناظر میں دیکھیں تو بیشتر معاملات میں خودنوشت سے یہ معلوم پڑتا ہے کہ انکے بچپن کو پرُ اَلم اور خار دار بنانے میں انکے والد کا کافی زیادہ رول رہا ہے۔انہوں نے اپنے والد کے کردار، رویے اور والدین کے باہمی تعلق ونزاع کے اسباب کا اظہار بھی خودنوشت میں بڑی بے باکی کے ساتھ کیا ہے۔

اختر الایمان اپنی ابتدائی کشمکش کے حوالے سے خودنوشت میں خود کی تعلیمی کشمکش سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ انکے والد انہیں اپنی طرح کا امام، حافظ اور قاری بنانا چاہتے تھے، لیکن انہیں ایسی تعلیم اور والد کی طرح زندگی گزارنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ اپنے والد کی رنگین مزاجی اور خانہ بدوشانہ زندگی کی وجہ سے کسی مدرسے میں مستقل طور سے تعلیم حاصل نہیں کر پا رہے تھے اور کافی پریشان رہا کرتے تھے۔انکے اندر ایک طوفان سا بار بار اپنی حالت کو دیکھ کے اُٹھ رہا تھا۔اس بے بسی کی زندگی اور اپنے گرد کے ماحول میں اکثر لوگوں کی زندگی کو دیکھ کر انکا خون کھول اُٹھتا تھا۔لیکن ناتجربہ کاری، کم عمری اور کسی شفیق کی شفقت وصحیح رہنمائی کی کمی کے باعث انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے، لیکن انہیں بس اتنا پتا تھا کہ اگر اس کسمپرسی کی حالت سے نکلنا ہے تو علم حاصل کرنا ہوگا مگر ساتھ ہی ذہن کو یہ تشویش دامن گیر تھی کہ پڑھنے کے حوالے سے وسائل کہاں سے مُیسّر آئیں؟

خودنوشت کے مطالعے سے جس بات کی طرف قارئین کا دھیان بار بار جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اختر الایمان اپنے مزاج کے اندر کافی ضد رکھتے تھے۔کہنا چاہیے انہیں یہ ضدی پن ورثہ میں ملا تھا کیونکہ انکے والد بھی اسی مزاج کے حامل تھے۔اس ضد کا نفسیاتی پہلو وہ ضد اور جبر بھی ہوسکتا ہے، جو انکے معاملے میں بچپن اور آغاز جوانی میں بھرتا گیا تھا۔اسی کا انتقامی جذبہ انکے لاشعور میں تا عمر موجود رہا جو ضد کی صورت میں نمودار ہوتا رہتا تھا۔

اختر الایمان کی جنسی اور ازدواجی زندگی کے بارے میں بات کریں تو ہم دیکھتے ہیں شادی سے پہلے انکے بہت سے ناکام معاشقے رہے تھے جن میں حسرت و یاس کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ستم ظریفی یہ کہ انکی شادی بھی انکی مرضی کے خلاف کردی گئی تھی۔جس کا خاتمہ آخر میں طلاق پر ہوا۔اگر

چہ اس کے بعد انکی شادی انکی پسند کی لڑکی سے ہوئی لیکن لاشعور میں سابقہ شکست و محرومیوں کا کانٹا کہیں نہ کہیں چُبھا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے دوسری شادی کے بعد بھی اختر الایمان کو وہ تشفی بخش جنسی و ازدواجی آسودگی نصیب نہیں ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انکا رشتہ شادی کے بعد بھی کئی عورتوں سے مسلسل رہا جن میں بعض عورتیں ان سے عمر میں بڑھی بھی تھیں۔ خودنوشت کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جنس کے معاملے میں وہ احساس کمتری میں نظر آتے ہیں، اس کی تلافی اور احساس برتری کے حصول کے لیے وہ کثرت سے تعلقات رکھ کر خود کو اور دُنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ میں احساس کمتری سے نجات پا رہا ہوں۔ اگر چہ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے بے باک ہو کے اپنے کئی معاشقوں کا ذکر کیا ہے تاہم ان واقعات میں جوش کی طرح ہوس نا کی نہیں ملتی۔ وہ جب کبھی عورت کا ذکر کرتے ہیں تو احترام کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ عورتوں کے متعلق اپنی خودنوشت میں جس نیک بینی اور مجموعی نظریہ کا اظہار کرتے ہیں اسکے مطابق عورت کوئی Sex Object نہیں بلکہ وہ زندگی میں توازن پیدا کرنے والی ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ انہوں نے بچپن سے آخری عمر تک جن سخت آلام و مصائب کا سامنا پے در پے کیا، ان ناموافق حالات اور آسائشوں سے دوری نے انہیں جنسی کج روی کے کیچڑ میں گرنے سے بچائے رکھا۔ اختر الایمان کی خودنوشت سے یہ واضح طور سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ نفسی اُلجھن اور کشمکش میں گرفتار ہیں۔ وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں جہاں وہ ایک طرف ماضی کی گھنگور سیاہی پاتے ہیں تو وہیں دوسری طرف مستقبل کی مخدوش صورتِ حال سے گھبراتے ہیں۔ ان کے دل میں ایک معصوم حزن و ملال کا گوشہ بھی نظر آتا ہے جس پر تحفظ کی دُھول نہیں پڑی ہے۔ اس صورتِ حال کی نظیریں انکی شاعری میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

آخر الکلام! اس بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ لاشعور تک رسائی حاصل کرنے والی لا تعداد دبی ہوئی خواہشیں یا یادیں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی مقام پر انسان کے اندر نفسیاتی کشمکش کو ضرور جنم دیتی ہیں، جس سے منفی اور مثبت دونوں طرح کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اختر الایمان نے بھی جو محرومیاں ابتدائی دور میں دیکھیں اور جو خواہشیں اور حسرتیں ان کے لاشعور کے اندر دفن تھیں، انکا اظہار زندگی کے مختلف مراحل پر کئی طریقوں سے ہوتا رہا۔ ایسے ہی تلخ و شیریں واقعات و تجربات اور اس سے پیدا شدہ

کشمکش سے نبرد آزمائی سے ''اس آباد خرابے'' کے مصنف کی ذات عبارت ہے، جسے سمجھنے کے لیے یہ خود نوشت بے حد ممد و معاون قرار دی جا سکتی ہے۔

﴿ختم شُد﴾